بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقام اقبالؒ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کے الفاظ کو یقیناً یاد رکھا اور ایسا یاد رکھا کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے قرآن کے معانی کو جس انداز سے بھلایا اس کی نظیر بھی شاید ہی کہیں ملے۔ صدر اول کے واقف اسرار، سراپا عمل، مسلمانوں کے بعد قرآن نگاہوں سے اوجھل ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ وہ غیر اسلامی تصورات کے غلافوں میں یوں چھپ گیا۔ جیسے چاند گہن میں آ جائے۔ صدیاں اسی کیفیت میں گذر گئیں اور پھر حالت یہ ہو گئی کہ یہی غیر اسلامی تخیلات عین اسلامی بن گئے اب مسلمانوں سے ان معتقدات کا چھڑانا گویا ان کی نگاہ میں انہیں دین سے بیگانہ بنا دینا تھا۔ ادھر یہ حالت تھی۔ ادھر یورپ کی مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ سے مذہبی اثرات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانا شروع کر دیا اور اس طرح ان کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ مذہب پرست طبقہ اپنی جگہ نوحہ کناں تھا کہ نوجوان طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا جا رہا ہے اور نوجوان طبقہ شکوہ سنج تھا کہ جس چیز کو ان کے سامنے حقیقت و بصیرت کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے ان کی فطرت اباء کرتی ہے غرضیکہ مسجدیں مرثیہ خواں تھیں کہ نمازی نہ رہے۔ اور بے نمازوں کی شکایت تھی کہ نمازیوں میں وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے۔ مذہب کے مدعیوں کو ہر مقام پر شکست ملتی تھی اس لئے کہ قرآن حکیم میں تو یہ جوہر موجود تھا کہ انسان علم و بصیرت کی جن بلندیوں تک چاہے اڑ کر چلا جائے۔ وہ وہاں سے بھی آگے ہی آگے نظر آئے۔ لیکن جن عجمی تصورات کو قرآن سمجھ کر پیش کیا جا رہا تھا۔ وہ تو انسانی دماغوں کی کاوش کا ہی نتیجہ تھے ان میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہو سکتی تھی کہ وہ بڑھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دے سکتے۔ حقیقی قرآن غرضیکہ دنیائے اسلام ایک عجیب پیچ تاب میں تھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ہر حساس نگاہ رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی

تھی کہ یااللہ! تیرے اس آخری پیغام کا کیا انجام ہونے والا ہے کہ رحمت ایزدی نے اپنے بندوں کی کسمپرسی پر ترس کھایا اور ان میں ایک ایسی گران مایہ ہستی کو پیدا کر دیا جس کی نگہ دور رس نے انسانی تحیلات کے تو بر تو پردوں کو قرآن کریم سے ہٹا کر عروس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اور وہ اسلام جو مدت ہائے دراز سے عجمی افسانوں کی وجہ سے چیستان بن چکا تھا پھر اسے اپنی فطری حالت میں پہچانا گیا فطرت کی کرم گستری سے اس ہستی کو دماغ ایسا عطا ہوا جو علم و حکمت کے بلند ترین مقامات پر پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کی محبت نے اس کے سینہ میں وہ قلب منور رکھ دیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہئے ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو ہزار پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت کو بھی بے نقاب دیکھ لے۔ اس نگہ حقیقت شناس کا نام ہے اقبالؒ

●●●

جب سے مسلمانوں میں مرکزیت فنا ہوئی تھی ان کے ہاں بھی دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے قائم ہو چکے تھے جس طرح عیسائیت میں کلیسا اور سلطنت تھی۔ ہندوستان میں گرہست آشرم اور سنیاس آشرم تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک بھی دنیا ایسی قابل نفرت شے ہو چکی تھی کہ ہر ممبر سے پہلی آواز یہ اٹھتی تھی۔ کہ طالب دنیا مردود' طالب عقبیٰ محمود اقبال نے آکر بتایا کہ اسلام کے متعلق یہ نظریہ یکسر غیر اسلامی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے دین وہ ہے جو مسلمانوں کے سامنے ایک مکمل دستور حیات پیش کرتا ہے۔ ایک نظام زندگی مرتب کر کے دیتا ہے جو ان کی ہر قدم پر رہنمائی کرتا ہے۔ سیاست' مدنیت' عمرانیت' معیشت' معاشرت سب دین ہی کی شاخیں ہیں۔ دنیا کا ہر وہ کام جس کی بناء تقوے پر ہو عین دین ہے۔ اور دین کا ہر وہ عمل جو ایک رسم بن کے رہ جائے عرف عام کے مطابق "دنیا" بن جاتا ہے۔ پھر اقبال نے محض یہ نظریہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ انہوں نے تمام مسائل حیات کا حل قرآن کریم کی روشنی میں تلاش کیا اور مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اور جو نئی تحریک جو نیا مسئلہ پیدا ہوا اس کے متعلق بتا دیا کہ اسلام کا اس باب میں کیا حکم ہو سکتا ہے۔

اجتماعی زندگی

پھر دین کے متعلق یہ غلط نظریہ رائج ہو چکا تھا کہ اس سے مقصود محض انفرادی نجات ہے یعنی ہر فرد کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی اپنی نجات ہو جائے۔ ملت کے اجتماعی معاملات "دنیا داروں" کے لئے رہیں۔ یہ عملی رہبانیت کا تصور تھا جو مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اقبال نے آ کر بتایا کہ یہ انفرادیت کی زندگی کبھی اسلامی زندگی نہیں ہو سکتی قرآن کریم تو ایک ایسا نظام زندگی پیش کرتا ہے جس کی رو سے ہر فرد جماعت یا ملت کا ایک زندہ رکن ہے۔ انفرادی اصلاح اس لئے ضروری ہے کہ ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم بنے وہ از خود اصلاح یافتہ قوم بن جائے۔ لیکن اگر افراد کے سامنے اجتماعیت کی زندگی کا تصور نہیں تو وہ لاکھ اصلاح یافتہ ہوں مقصد زندگی سے بہت دور ہوں گے۔ فرد جب تک اپنے آپ کو ملت کے اندر جذب نہیں کر دیتا کبھی اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اسلام جماعت ہے اور جماعت نام ہے ایک نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا۔ یہ نظام مرکز سے قائم ہوتا ہے اور مرکز ملت وہ امام متفقہ علیہ ہے' وہ امیر ہے جس کی اطاعت عین خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت ہو جاتی ہے۔

●●●

پھر دین کے متعلق یہ تصور ذہنوں میں جاگزین ہو چکا تھا کہ عبادت و اعمال کے نتائج محض اخروی زندگی میں جا کر مرتب ہوں گے۔ ثواب نام رہ گیا تھا ایک ایسے نظریے کا جس کی کوئی محسوس توجیہ اس دنیا میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اس غلط نظریے کی تخلیق کا سبب یہ تھا کہ جب اسلامی مرکزیت تباہ ہوئی تو اعمال انفرادی رہ گئے۔ اسلامی اعمال و عبادات اپنے صحیح نتائج اسی وقت پیدا کرتے ہیں جب وہ ایک اجتماعی نظام کے اندر رہ کر کئے جائیں۔ جب کوئی پرزہ ایک مشینری کے اندر اپنی جگہ پر ٹھیک فٹ ہو گا تو اس کی ہر حرکت جو باقی پرزوں پر بھی اثر انداز ہو گی۔ ایک نتیجہ مرتب کرے گی لیکن وہی پرزہ اگر کہیں الگ پڑا ہو تو وہ لاکھ گھومتا رہے کوئی محسوس نتیجہ پیدا نہیں کرے گا یہی وجہ تھی کہ وہ اعمال حیات جو انفرادی حیثیت اختیار کر چکے تھے وہ نتائج مرتب نہیں کرتے تھے۔ جو قرن اولیٰ کے

مسلمانوں کے اعمال سے مرتب ہوتے تھے۔ لوگ اعمال و اشغال میں منہمک رہتے تھے لیکن ان سے نتائج ایسے برآمد نہیں ہوتے تھے جو ان کی دنیاوی زندگی کی زبوں حالی کو سربلندی و سرفرازی میں بدل دیں۔ اس وقت اگر نصیبہ یاوری کرتا تو یہ حقیقت سامنے آ جاتی کہ چونکہ اجتماعی نظام فنا ہو چکا ہے اس لئے یہ اعمال صحیح نتائج مرتب نہیں کر سکتے ان کے بار آور ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پھر سے وہی نظام قائم کیا جائے لیکن چونکہ مسلمانوں کے عذاب کی مدت جلدی ختم نہیں ہونے والی تھی۔ اس لئے بالعموم یہ سمجھ لیا گیا کہ دینی اعمال کا دنیاوی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ان کے نتائج بعد کی زندگی میں ہی مرتب ہوں گے۔ اقبال نے آ کر بتلایا کہ اعمال صالحہ سے مفہوم یہ ہے کہ وہ انسان میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ موجودہ دنیاوی زندگی میں عزت و وقار' شوکت و حشمت' دولت و ثروت' حکومت و سلطنت کی زندگی بسر کرے اس کے بعد کی زندگی میں وہ تمام کامیابیاں نصیب ہوں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اعمال و عبادات اگر ایسے جیتے جاگتے نتائج مرتب نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ اس طریقہ کار میں کہیں نہ کہیں نقص موجود ہے۔ وہ نقص یہ ہے کہ آج وہ نظام زندگی گم ہے جن کے اندر رہتے ہوئے یہ اعمال حقیقی معنوں میں اعمال صالحہ بنتے تھے۔

●●●

اجتہاد

پھر مذہب کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہو چکا تھا کہ مذہب جتنا کچھ سمجھا جانا تھا۔ سمجھا جا چکا۔ اس کے بعد کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذہب کے بارے میں مزید تحقیق و اجتہاد سے مسائل زندگی کا ایسا حل تلاش کرلے جو زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دے سکے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ مسلمان ایک ماضی پرست قوم بن کر زندگی کی دوڑ میں سینکڑوں برس پیچھے رہ گئے۔ اقبال نے ہمیں یہ بتلایا کہ دین کے مکمل ہونے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس کے متعلق سینکڑوں برس پیشتر اپنے ماحول کے ماتحت جو کچھ کسی ایک عالم نے سمجھ لیا تھا وہ حرف آخریں ہے اور اس پر اضافہ یا ترمیم کفر

والحاد ہے بلکہ اکملیت دین اور ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اصولی طور پر انسانی ضروریات کے لئے جو کچھ درکار تھا وہ سب کا سب قرآن کریم اور اسوۂ حسنہ کے اندر آ چکا اب ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق فروعی مسائل کا حل الگ الگ مستنبط ہوتا رہے گا۔ یورپ اس لئے تباہ ہوا کہ اس کے پاس مسائل حیات سے متعلق کوئی غیر متبدل اصولی قوانین نہ تھے اور مسلمان برباد ہوئے اس لئے کہ انہوں نے بدلتے رہنے والے فروعی مسائل حیات سے متعلق احکام کو بھی غیر مبدل سمجھ لیا۔ ماضی سے متمسک رہنا اس لئے ضروری ہے کہ جو سرمایہ علمی ہمارے بزرگ ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں اس کی مدد سے ہم اپنے مستقبل کو درخشندہ و تابناک بنالیں۔ نہ یہ کہ ماضی تو درخشندہ رہے اور مستقبل تاریک ہوتا چلا جائے۔ اس باب میں ارباب ذوق کو حضرت علامہ کے خطبات کے مجموعہ (Reconstruction of Religious Toughts) کا مطالعہ کرنا چاہئے جو اسلامی باب تحقیق و اجتہاد میں اپنے انداز کی ایک ہی کتاب ہے اور جو ہماری بدقسمتی سے ہمارے لئے ابھی تک ایک کتاب مختوم (Sealed Book) کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے۔

●●●

مادہ پرستی

ایک طرف تو اقبال نے مذہب پرست طبقہ کے سامنے دین سے متعلق وہ حقائق پیش کئے جن کی رو سے وہ اسلام جو ایک عرصہ سے متاع گم گشتہ ہو چکا تھا۔ پھر سے آنکھوں کے سامنے آگیا۔ دوسری طرف انہوں نے یورپ کی مادہ پرستی کے سرکش طوفاں کو روکنے میں جہاد شروع کیا۔ یورپ بزعم خویش ہر نظریہ کو علم و عقل کی روشنی میں پرکھنے کا مدعی تھا۔ اور اس نظر فریب خوش آئند نظریہ کے ماتحت وہ مسلمانوں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مذہب سے برگشتہ کئے جا رہا تھا۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ کے پاس اس الحاد و بیدینی کا علاج سوائے فتوئ کفر کے اور کچھ نہ تھا۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا کہ دشمن کا مقابلہ اس قسم کے ہتھیاروں سے کرو جو اس کے

پاس ہوں۔ اقبال حکمت و فلسفہ کی ان بلندیوں تک پہنچ چکا تھا کہ خود اہل یورپ اسے آئمہ فن میں سے تسلیم کرتے تھے ان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس نے قرآن کریم کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور یورپ کی مادہ پرستی کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیرنی شروع کر دیں۔ انہوں نے بتا دیا کہ وہ دین فطرت جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے کس طرح عین علم و بصیرت ہے اور وہ ظن و قیاس جسے یورپ علم و بصیرت سمجھ رہا ہے کس طرح عین جہل و ظلمت ہے۔ یورپ کی مادہ پرستی اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے اس کے بعد فنا ہے۔ اخروی زندگی ایک واہمہ ہے۔ اقبال نے اسی نظریہ ارتقاء کے مسلمات کی رو سے اس حقیقت عظمیٰ کو ثابت کردیا کہ موجودہ زندگی سلسلہ ارتقا کی آخری کڑی نہیں بلکہ ایک آنے والی زندگی کا پیش خیمہ ہے زندگی ایک جوئے رواں ہے جو بڑھتی چلی جائے گی۔ اور بقاء للا صلح (Survival of the Fittest) کے اٹل قوانین کے مطابق بقاء اسی کو نصب ہو گی جو اصلح ہو گا اور اصلح وہی ہو سکتا ہے جس کے قلب و جوارح کے اعمال قرآن کریم کے مطابق ہوں اقبال نے اسلامی نظریہ حیات کو علمی انکشافات کی روشنی میں پیش کر کے صرف یورپ کی مادہ پرستی کا ہی کا ابطال نہیں کیا بلکہ تمام نوع انسانی پر اس کا احسان عظیم ہے کہ اس نے انسانیت کی قدر قیمت کو بڑھا کر اس اوج ثریا پر پہنچا دیا کہ وہی انسان جو قلب کی حرکت بند ہو جانے کے بعد مٹی کا ایک تودہ بن کے رہ جاتا تھا اب ایک ایسی حیات جاوداں کا مالک بن گیا کہ موت اس کے نزدیک شب تیرہ و تار کے بعد ایک نورانی صبح کے طلوع کا نام ہو گیا۔ اقبال نے دنیا کو اس باب میں اس راز سربستہ سے آگاہ کردیا جو اس کی موجودہ زندگی کے آخری الفاظ تھے۔

"میں مسلمان ہوں۔ موت سے کیوں ڈروں۔ موت کا تو میں خندہ پیشانی سے استقبال کروں گا!!!"

زندگی کے متعلق جب یہ نظریہ قائم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے انسان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جس سے دنیا میں عدل و انصاف قائم رہ سکتا ہے۔

یورپ کے نظریہ مادہ پرستی نے ایک اور بھی ہلاکت آفریں خرابی پیدا کر رکھی ہے۔ مادہ پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر شے کی قدر و قیمت کاروباری میزان سے ہی متعین کرتا ہے جب کوئی کمزور و ناتواں کسی صاحب قوت سے امداد کا طالب ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کاروباری زاویہ نگاہ سے (From Business Point of View) اس غریب کی مدد کرنا اس کے لئے زیادہ منفعت بخش ہے یا اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہڑپ کر جانا۔ وہ دنیا کے ہر معاملہ کو اس "کاروباری" میزان سے تولتا ہے اور جس شکل میں اسے منفعت نظر آتی ہے اسے بلا تامل اختیار کر لیتا ہے۔ یورپ کا جدید ضابطہ اخلاق اس اساس پر مبنی ہے۔ اور آج دنیا جس جہنم سے گزر رہی ہے وہ اساس کا فطری نتیجہ ہے۔ اقبال نے آکر بتایا کہ یہ نظریہ حیات ابلیسانہ مکر و فریب کا جال ہے اخلاق کا وہی ضابطہ انسانیت کے امن و فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے جو انسانوں سے بلند۔ جذبات سے مبرا۔ خود غرضی اور مصلحت کوشی سے منزہ کسی ہستی کا متعین فرمودہ ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان وحی الٰہی کا محتاج ہوتا ہے۔ مدبرین یورپ کی تمام سیاسی بساط اقبال کی نگاہوں کے سامنے تھی جونہی کوئی مہرہ اپنی جگہ سے سرکتا وہ دیدہ ور فوراً بھانپ لیتا کہ یہ چال اب کس مصلحت اندیشی کے ماتحت چلی جا رہی ہے۔ اس لئے وہ للکارتا کہ ہوشیار رہنا۔ بہیمیت و بربریت کا وہی گرگ باراں دیدہ اب ناصح مشفق کا نقاب اوڑھ کر آ رہا ہے۔ جن جن امور کے متعلق اقبال نے پیشین گوئیاں کی تھیں۔ دنیا اس وقت ہنستی تھی کہ یہ دیوانہ کیا کہہ رہا ہے لیکن وقت آنے پر دنیا نے دیکھ لیا کہ دیوانہ تو خود وہی تھی۔ جسے وہ دیوانہ کہتی تھی اس کی "دیوانگی" پر ہزار عقلیں قربان تھیں۔

آج سے بیس برس پہلے جبکہ تمام دنیا کی نگاہیں لیگ آف نیشنز کی طرف لگ رہی تھیں اور دنیا سمجھ رہی تھی کہ بس اب انسانیت سے متعلق ہر مصیبت کا علاج ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس وقت اس جمعیت کو کفن چوروں کی جماعت کہنا اقبال ہی کی نگہ دور رس کا کام تھا۔ آج سے تیس سال پیشتر جبکہ تہذیب یورپ اپنی انتہائی بلندیوں پر مسرت کے جھولے جھول رہی تھی اس کے متعلق کہتا کہ۔

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خود کشی کرے گی۔

اسی دیدہ وری کی بصیرت کا نتیجہ تھا۔ آج سے اٹھارہ برس پہلے جس وقت ترکی کی لاش پر تمام یورپ کے گدھ منڈلا رہے تھے یہ کہہ دیتا کہ :-

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اسی مفکر اعظم کی نکتہ دور رس کا کام تھا۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں آپ کو کلام اقبال سے مل سکیں گی۔

●●●

وحدت انسانیت

مادہ پرستی کی لعنت سے ایک اور مصیبت شروع ہوتی ہے۔ چونکہ مادیت سے انسان کی نگاہیں ہمیشہ محسوسات میں گھری رہتی ہیں اس لئے انسانوں کی تقسیم محسوس حدود و قیود سے کی جاتی ہے زبان' نسل رنگ' وطن کی تفریق سے انسانی جماعتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ وہ جہالت کبریٰ ہے جو آج انسانیت کی امن سوزی کی سب سے بڑی ذمہ دار ہے۔ یہ تفریق اس وقت شروع ہوتی ہے جب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ انسان جس چار دیواری کے اندر پیدا ہوا ہے اس کی باہر کی دنیا سے اسے کوئی قلبی واسطہ نہیں نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کی جماعتیں خونخوار بھیڑیوں کا گروہ بن جاتی ہیں کہ ایک بھٹ کا بھیڑیا دوسرے بھٹ کے بھیڑیئے کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ اقبال نے آکر بتایا کہ یہ تقسیم انسانیت کس درجہ تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس نے ثابت کردیا کہ حیات تمام انسانوں میں ایک مشترکہ جوہر ہے۔ تمام انسانوں کی تخلیق نفس واحد سے ہوئی ہے یہ گروہ بندیاں' یہ زبان نسل' رنگ' وطن کی بناء پر اقوام کی تعمیر دعہد جہالت کی یادگاریں ہیں۔ اتحاد و ایتلاف کی بناء شرف انسانیت اور اخوت بشری پر ہونی چاہئے۔ جو انسان شرف انسانیت (تقویٰ) میں بڑھا ہوا ہے۔ وہی اکرم ہے۔ اور وہ تمام انسان جن میں یہ شے قدر مشترک ہے ایک قوم کے افراد ہیں خواہ وہ کسی نسل کے انسان ہوں کوئی زبان بولتے ہوں دنیا کے کسی حصہ میں رہتے ہوں۔ قوموں کی تشکیل اس نظریہ زندگی سے ہونی چاہئے جسے کفر و ایمان کا نظریہ

کہتے ہیں نہ کہ نسلی اور وطنی حدود بندیوں کی رو سے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج مادہ پرست انسان کی خودغرضی اور جوع الارضی اس نظریہ کے قبول کرنے سے اسے روکتی ہے۔ اور بار بار روکتی ہے کہ اس کے قبول کرنے سے اس کے خود تراشیدہ بت ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن دنیا جب باہمی خونریزیوں اور فتنہ پردازیوں سے تھک جائے گی۔ اس کا شعور نفس بلند ہو جائے گا۔ تو وہ خود بخود تسلیم کرے گی کہ نوع انسانی کے مصائب کا حل فی الواقعہ اس نظریہ کے اندر ہے جو اس اسلامی مفکر نے پیش کیا تھا۔ وہ اسلامی مفکر جس نے اپنی موت سے کچھ ہی عرصہ پیشتر پوری قوت کے ساتھ اس چیز کا اعلان فرمایا کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے متعلق صرف وہی قانون قابل قبول ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اور ہر وہ آئین جو اس کے خلاف ہو یکسر نامعقول اور مردود ہے۔

●●●

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک حقیقی اقبال کی۔ وہ اقبال جو اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا تھا بلکہ ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں تلاش کرتا تھا اور اس تلاش میں وہ کسی غیر کا منت کش نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

اس کی صہبائے بصیرت براہ راست خمستان حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آتی تھی۔ اقبال نے جب دعویٰ کیا تھا کہ

جہاں راجز بہ چشم خود نہ بینم

تو یہ محض شاعری ہی نہ تھی ایک حقیقت نفس الامری تھی۔ پھر فطرت کا کرم بالائے کرم کہ ان حقائق کے بیان کرنے کے لئے اسے ذریعہ ایسا حسین و دلکش عطا ہوا کہ جو دیکھے کھنچا ہوا چلا آئے۔ یہ ذریعہ تھا اقبال کی شاعری! اب غور فرمایئے کہ اقبال کو محض ایک شاعر ہی سمجھ لینا کچھ ایسا ہی ہے جیسا بلا تمثیل قرآن کریم کو محض ایک ادبی صحیفہ تصور کر لینا۔ جب اقبال کا صحیح مقام متعین کر لیا جائے تو پھر سمجھ میں آسکتا ہے کہ اقبال کو فطرت نے کس مقصد عظیم کے لئے پیدا کیا تھا۔ اور اس مقصد کو اس نے کس حد تک پورا کیا۔ وہ یہ سمجھانے کے لئے نہیں آیا تھا کہ زمین شعر میں گلکاریاں کس طرح کی جاتی ہیں بلکہ وہ یہ

بتانے کے لئے آیا تھا کہ یہ زمین کس طرح بدل سکتی ہے۔ یہ آسمان کس طرح بدل سکتا ہے۔ اور مسلمانوں کو ان کی عظمت گم گشتہ پھر سے کس طرح مل سکتی ہے۔ پوچھا جائے گا کہ اقبال نے کام کیا کیا؟ یہ سوال پھر اس طبقہ کی طرف سے اٹھے گا۔ جس کی نگاہیں محسوسات میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ وہ طبقہ جو اوج طالع لعل و گہر" کی بجائے کسی کے جوہر طرف کلاہ" کی طرف دیکھتا ہے۔ جو کسی کی عظمت کا اندازہ اس سے لگاتا ہے کہ اس نے اینٹوں اور پتھروں کا کتنا بڑا انبار جمع کیا تھا۔ وہ کسی کی شان و شوکت کے لئے یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی گاڑی کو کتنے گھوڑے کھینچتے تھے۔ کتنے ہاتھی اس کے جلوس میں تھے کتنا وسیع پنڈال اس کی آمد کی تقریب میں تعمیر ہوا تھا کتنے لاکھ انسان اس کے گرد و پیش "زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے جو لوگ کسی کے اعمال حیات کو ان میزانوں سے تولتے ہیں ان کے لئے اس سوال کا جواب بڑا مایوس کن ہو گا۔ لیکن جن کی نگاہیں محسوسات سے گذر کر حقائق کو پرکھتی ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ اقبال نے کیا کیا۔ کسی کی دنیا بدلنے کے لئے یہ مہمل ہے کہ اس کے مکان کا نقشہ بدل دیا جائے۔ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ اس کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا جائے۔ اس کا نظریہ زندگی بدل دیا جائے کہ۔

اگر نگاہ تو دیگر شود جہان دگر است

اقبال نے اپنے طریق کار میں اس روش کو اختیار کیا جو پیغمبروں کی تجویز فرمودہ ہوتی ہے۔ اور مقام محمد ﷺ عربی کے ایک سچے شناسا کو کرنا بھی یہی چاہئے تھا اقبال نے کشتی کا رخ بدلنے کی بجائے پانی کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس نے اشیاء کا رنگ تبدیل کرنے کی بجائے نگاہوں کی عینک کا رنگ بدل دیا۔ اس نے جسموں کو نہیں چھوا بلکہ دلوں کو بدل دیا اور یہ ظاہر ہے کہ دل کے بدل جانے سے دنیا بدل جاتی ہے۔ قرآن کریم کے اصول کے مطابق قوموں کی حالت بدلنے کے لئے ان کے "نفوس" کی حالت بدلنی ضروری ہوتی ہے۔ اقبال نے قوم کی نفسیاتی کیفیت کو بدل دیا اس نے مسلمان کو پھر سے اس کا بھلایا۔ سبق یاد دلایا۔ اس نے ایک نیا دین پیش کیا اور یہ "نیا دین" وہی "اصلی دین" تھا جو نبی اکرم ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اس جماعت کے سامنے پیش کیا تھا۔ جس جماعت نے انسانیت سے متعلق ہر باطل نظریہ کو بدل دیا اور دنیا کو بتا دیا کہ "خدا کی بادشاہت" سے

کیا مفہوم ہے۔ اب کہئے کہ اقبال نے کچھ کیا ہے کہ نہیں!

●●●

لیکن بایں ہمہ اقبال نے اپنی زندگی کے مشن کا محض ایک خاکہ تیار کر کے دے سکا۔ اس میں رنگ بھرنا باقی رہ گیا۔ ابھی اس نے بہت کچھ کرنا تھا لیکن اسے کچھ کرنے کی مہلت نہ دی گئی اور اس کی تمام تر ذمہ داری اس تیرہ بخت قوم کے سر عائد ہوتی ہے جس میں وہ پیدا ہو گیا۔ وہ گوہر نایاب اس بازار میں آ گیا۔ جہاں کوئی اس کی قدر و قیمت سے واقف نہ تھا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی عمر کا ایک لمحہ بڑھا دیا جا سکتا۔ لیکن یہ تو ہو سکتا تھا کہ اسے اتنی فرصت دیدی جاتی کہ وہ اپنا مشن پورا کر جاتا۔ اقبال گداگر نہیں تھا اس کی خودداری نے کسی کا دست نگر ہونے کی بجائے موت کو ترجیح دی۔ لیکن جب اس نے اپنے دل و دماغ کی بہترین متاع قوم کے حوالہ کر دی تو کیا اس کے بدلے میں احسان شناسی کا تقاضا نہ تھا۔ کہ قوم اسے فکر معاش سے تو آزاد کر دیتی! اگر وہ اپنے اس دل و دماغ کو "اپنے لئے" صرف کرتا تو کیا وہ "ہنری فورڈ" نہ بن جاتا! لیکن وہ اپنے لئے زندگی بسر کرنے کو نہیں آیا تھا۔ وہ دوسروں کی خاطر جینے اور دوسروں کو زندگی کا پیغام دینے کے لئے آیا تھا۔ وہ دوسروں کی خاطر جیا اور دوسروں کے خاطر ہی اس نے جان دیدی۔ لیکن اس جوہر ناشناس قوم کو قطعاً احساس نہ ہوا کہ خدا کی کتنی بڑی نعمت نایاب یوں ہاتھوں سے چھن رہی ہے اگر قوم اقبال کی قدر کرتی تو یہ خود اسکے اپنے فائدے میں تھا۔ عمر بھر اقبال کو تمنا رہی کہ اگر پانچ سات برس فراغت کے میسر آ جائیں تو وہ یورپ کے کتب خانوں میں بیٹھ کر قرآن کریم اور فقہ اسلامی سے متعلق دو کتابیں لکھ دے۔ سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اگر حضرت علامہؒ کی یہ تمنا پوری ہو جاتی تو وہ کیا چیزیں قوم کے لئے چھوڑ جاتے! اقبال نے اسی تمنا میں دنیا کو الوداع کہہ دیا اور حقائق کا گراں بہا خزانہ جو اس کے سینہ پر نور میں محفوظ تھا تہ خاک مدفون ہو گیا۔ قوم اب انتظار کرے کہ پھر سے اقبال پیدا ہو اور ان دبے ہوئے خزانوں کو نکالے۔ لیکن اس سادہ لوح قوم کو کیا خبر کہ ایک اقبال پیدا کرنے کے لئے فطرت کو کون کون سے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ذرا قوم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈال کر دیکھے تو سہی کہ اس سے پہلے کوئی اقبال کب پیدا ہوا تھا اور اس حساب سے خود ہی فیصلہ کرے کہ اب پھر کوئی اقبال کب پیدا ہو گا۔ سو رونا آج اقبال کی موت کا نہیں۔ رونا قوم کی بدنصیبی کا ہے۔ رونا اس کی شور بختی کا ہے اس بات کا ہے کہ اس کے عذاب کی مدت پتہ نہیں کب ختم ہو گی۔ اقبال نے اس بلند مقام پر پہنچ چکا تھا جو موت کی دسترس سے بالاتر ہے۔ وہ مرد مجاہد تھا۔ اس نے تمام عمر ایک مسلسل جہاد میں گذار دی اور اس میدان جہاد سے زندگی کی اگلی منزل کی طرف قدم بڑھا دیا لہٰذا اقبال کو مردہ کون کہہ سکتا ہے۔ وہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا **وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ**۔ مردہ تو ہے وہ قوم جو اس رازِ حیات کو نہ سمجھ سکی۔ آخری دنوں طبیبوں نے جب یہ فیصلہ دے دیا کہ اگر حضرت علامہؒ نے اپنے دل و دماغ کو اسی طرح مصروف کار رکھا تو زیادہ عرصہ تک ہم میں نہیں رہ سکیں گے۔ تو انہوں نے عملاً اس کا جواب وہی دیا جو وہ عمر بھر کہتے رہتے تھے کہ

حدی را تیز تر می خواں چوں محمل راگراں بینی

یہ سمجھ کر کہ اب زیادہ عرصہ تک انہیں اس دنیا میں نہیں رہنا ہو گا وہ اور گرمجوشی اور ولولہ اندازی کے ساتھ مصروف مجاہدت ہو گئے۔ انہیں بیتابی تھی کہ جو کچھ میری نگاہوں نے دیکھا ہے اسے دوسروں کو بھی دکھاتا جاؤں۔ موت قریب آ رہی تھی اور انہیں یہ فکر راتوں کو سونے نہ دیتی تھی کہ کس طرح اپنی قوم کو سمجھاؤں کہ وہ تباہی اور بربادی کے کن عمیق و مہیب غاروں کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ فکر موت کو اور قریب تر کر رہی تھی۔ اسی کشمکش میں اس شہید ملت نے پیک اجل کو نہایت خندہ پیشانی سے لبیک کہا۔ اور وہ آنکھیں جو حق و باطل کا فیصلہ ایک نگاہ میں کر دیتی تھیں۔ ابدی نیند سو گئیں۔ وہ دل جو قوم کے درد میں سیماب وار تڑپتا رہتا تھا ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔ نہیں! جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اقبال کے دل کی حرکت بند نہیں ہوئی بلکہ ملت اسلامیہ کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ کہ نبض ملت میں تموج تھا تو اسی سے' جسد اسلامی میں زندگی تھی تو

اس کے دم سے۔ روح اڑ گئی اور جسم باقی رہ گیا۔

اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر

جب سنتا ہوں کہ حضرت علامہؒ کے جنازہ کے ساتھ ہزاروں کا مجمع تھا۔ بڑے دھوم سے جلوس نکالا گیا تو دل کی ٹیس ایک عجیب سی ہنسی بن کر لب تک آتی ہے۔ وہی قوم جس نے جیتے جی کبھی پوچھا نہیں کہ یہ نادرہ روزگار ہستی کس غم میں گھلی جا رہی ہے۔ وہ آج اس کے غم میں یوں صف ماتم بچھا کر بیٹھ رہی ہے۔

"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

لیکن فطرت کچھ ایسی ارزاں فروش واقع نہیں ہوئی کہ وہ ایک ایسی متاع گراں بہا کا معاوضہ چند آنسو چند تعزیتی پیغام' اور چند ماتمی مظاہرے کافی سمجھ لے فطرت اپنے انتقام میں بڑی سخت گیر واقع ہوئی ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اس جوہر بے بہا کی قدر ناشناسی سے قوم نے جس قدر اپنا نقصان کیا ہے اس کا کفارہ اب اس طرح ہو سکتا ہے کہ اقبال جو پیغام چھوڑ گیا ہے۔ اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا جائے اور اس نورانی شمع کو ہاتھ میں لیکر دنیا سے ہر باطل کی تاریکی کو مٹا دیا جائے۔ تمہارے دلوں میں یاد ہو تو اقبال کی۔ تمہاری محفلوں میں چرچا ہو تو اقبال کا۔ تمہاری درسگاہوں میں تعلیم ہو تو پیام اقبال کی۔ تمہارے واعظ وعظ کہیں تو اس کا۔ تمہارے خطیب خطبہ دیں تو اس کا۔ اٹھو تو اقبال سامنے ہو بیٹھو تو اقبال سامنے ہو۔ تمام عالم پیام اقبال سے گونج اٹھے اور اس طرح تمہاری خاک کے ذروں سے ایک نئی دنیا تعمیر ہو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو یاد رکھو۔ اقبال تو زندہ ہے زندہ رہے گا لیکن تم مٹ جاؤ گے۔ اور۔

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں